داستان

جل

گ

ں

ل گرجے

ھوڑے کی ندا

جل گر ج

عدالت علی نے حقے کی نے موڑ کر حکیم جی کی طر

"حکیم جی رات اب کچھ لمبی ہونے لگی ہے"

حکیم جی نے حقے کا گھونٹ لیا، بولے "راتیں ا

بدل رہا ہے"

"جاڑے آ ہی گئے سمجھو، حکیم جی"

"ہاں بس یہ سمجھو کہ اگلے چاند سے چرپائیاں اند

لئے جب میں وضو کرتا ہوں تو پانی ٹھنڈا لگتا ہے۔

غنی بولا "حکیم جی آپ سے داستان سنتے ہ

صدیق اور نصیر نے بھی تائید کی "ہاں حکیم جی

حکیم جی نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے "یار وا

سب ذرا چپ ہوئے۔ عدالت علی بولے

"میاں دن بیت گئے۔ اب کیا یاد کرنا

وقت"

"اور فساد کب شروع ہوئے تھے؟" غنی

عدالت علی بولے "میاں فساد تو جون ہی

ف۔ کردی۔ پھر لمبی سی جماہی لی، بولے

ب تو لمبی ہوتی ہی چلی جائیں گی۔ موسم

ر چلی جائیں گی۔ اب ابھی فجر کی نماز کے

"

ئے بہت دن ہوگئے۔"

بہت ہی دن ہوگئے داستان سنتے ہوئے۔"

ب تو ہم خود داستان ہوگئے"

حکیم جی ہم کب چلے تھے۔"

س وقت کو۔ برسات جا رہی تھی اس

نے سوال کیا۔

یں شروع ہوگئے تھے۔"

حکیم جی نے ٹھنڈا سانس بھرا، بولے "میاں اور کسی چیز کا غم نہیں مجھے اپنی داستانوں کا غم ہے۔ وہ داستان میں نے جمع کی تھی کہ طلسم ہوش ربا اس کے سامنے گرد تھی۔"

صدیق نے پھر اصرار کیا "حکیم جی داستان سنتے بہت دن ہو گئے۔"

"میاں داستانیں ہندوستان میں رہ گئیں اور وہاں بھی کہاں، اپنا سارا داستان خانہ لٹ گیا، ورق ورق بکھر گیا۔ ایسے لٹے جیسے غدر میں گھر لٹے تھے۔"

پھر سب چپ ہو گئے۔ حکیم جی آنکھیں بند کئے خاموش حقہ پیتے رہے پھر انہوں نے نے غنی کی طرف کر دی۔ پھر بولے "دوستو داستانیں اپنی ہندوستان میں رہ گئیں۔ لٹ گئیں اب ان کی یادیں باقی ہیں۔ کیا سناؤں کہ اب کوئی داستان مسلسل یاد نہیں۔ کوئی کوئی ٹکڑا خواب کی طرح یاد آتا ہے، بس اس میں گم ہو جاتا ہوں۔ ہاں ایک سچی داستان یاد آئی وہ سن لو۔ میاں عدالت علی تمہیں وہ فقیر یاد ہے جو ہمارے مطب کے سامنے بیٹھا رہتا تھا اور چلایا کرتا تھا۔

ندی نربدا کا جل گرجے گرجے گنگا کی دھار۔

"ہاں ہاں یاد ہے۔"

"وہ فقیر نہیں تھا۔"

"اچھا؟"

"ہاں وہ فقیر نہیں تھا۔ دو ستو ستمبر کا مہینہ ستم ہوتا ہے۔ دو موسم دو زمانوں کی طرح ملتے اور جدا ہوتے ہیں۔ اس مہینے اودبدا کر اس پہ جنون کی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ اور راتوں کو چلاتا تھا۔

ندی نربدا کا جل گرجے گرجے گنگا کی دھار۔

میں اس کا بہت علاج معالجہ کیا مگر اس کے جنون میں کوئی فرق نہ آیا اور اس کے مرض کی بالکل تشخیص نہ ہو سکی۔ اس واقعہ نے مجھے ایسا شک میں ڈالا کہ اپنی حکمت سے

میرا اعتبار اُٹھ چلا۔ اس فقیر نے جب میری یہ کیفیت دیکھی تو ایک روز بھرے مطلب میں مجھ پر قہقہہ لگایا اور بولا کہ "اے حکیم، اے نادان معالج تو کس کا علاج کرتا ہے میں جنونی نہیں ہوں، جنوں تجھے البتہ ہے"۔ میں اس کے فقرے پر کچھ خفیف کچھ کبیدہ خاطر ہوا۔ تب وہ میرے روبرو ہو بیٹھا اور ایسی داستان عبرت فزا سنائی کہ میں کیا مطب میں بیٹھے ہوئے سب لوگ سناٹے میں آ گئے۔"

حکیم جی نے حقے کے گھونٹ لئے، کھنکارے، پھر کہنے لگے "یارو ذرا کان دھر کے سنو اور درس عبرت حاصل کرو۔ یہ ایک گزرے زمانے کا فسانہ ہے اور مٹے شہروں کی داستان ہے کہ گلی کوچے ان کے کہانی اور لوگ وہاں کے فانی ہوئے۔ پر سوچو تو یہ آج کی بھی داستان ہے کہ اب کے بھی ہمارے شہر اسی فتنۂ فرنگ اور اسی چرخ کے نیرنگ سے اسی طرح بے چراغ ہوئے اور حویلیاں اسی روش خاک کے ڈھیر بنیں۔ اہل شہر کا اعتبار اسی طور لٹا اور عزت دار یکیں اسی طرح کچھ پیوند زمین ہوئے، کچھ دربدر خاک بسر ہوئے۔

ہاں تو دوستو وہ فقیر میرے روبرو چوکی پر دوزانو ہو بیٹھا اور سب کو مخاطب کر کے اپنی دل خراش داستان یوں شروع کی۔

جو جانتا ہے وہ جانتا ہے، جو نہیں جانتا وہ جان لے کہ میں سمند خاں ابن ارجمند خاں ابن دماوند خاں سالار اعظم نخت خان کے لشکر طوفان اثر کا ایک ادنیٰ سپاہی ہوں کہ ہر چند کہ فرنگیوں نے اس شیر بیشۂ شجاعت کے نام کو مٹانے اور کارناموں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے لیکن آفتاب پر کس نے پردہ ڈالا ہے۔ شجاعت کی اس کی دھوم از ہند تا شام و روم ہے اور بریلی سے دلی تک جس جس بستی سے اس کے لشکر کا گزر ہوا ہے۔ مرد اس کے نام کی قسم کھاتے ہیں۔ جاڑوں کی راتوں میں چوپالوں میں الاؤ جلتے ہیں اور اس کی دلاوری کی داستانوں سے سینوں میں آگ دہکتی ہے اور خون گرم ہوتا ہے اور بوڑھی دادیاں، نانیاں بچوں کو اس کی بہادری کی کہانیاں سناتی ہیں اور کنواریاں

لڑکیاں بالیاں اس کی واپسی کے گیت گاتی ہیں۔

دوستو، دلی نے ہمیں بہت خراب کیا۔ بریلی سے دلی تک کی راہیں گواہ ہیں کہ ہم کیونکر بریلی سے طوفان بن کر اٹھے تھے اور آندھی دھاندی دلی چلے تھے۔ ہمارے گھوڑوں کی ٹاپوں سے جنگل کھنڈل گئے، پہاڑ مسل گئے۔ پہاڑوں، ریگزاروں کو روندتا جنگلوں، باغوں، کھیتوں کو کھوندتا لشکر طوفان انڈ دلی پہ امنڈا۔ پر دلی کی راہیں زلف گرہ گیر بن گئیں۔ مغلوں نے میرے آقا سے نامدار سے دغا کی۔ روز، ہم صبح کو کمر کستے تھے اور سوچتے تھے کہ آج رن پڑے گا اور روز شام کو کمر بن کھول دیتے تھے شکست، اس شہر نامبارک کی پیشانی پہ رقم تھی مجھے آج بھی اچھی طرح یاد ہے کہ روز تڑکے ہیں مجھے خیمے کے پیچھے سے اس کمبخت فقیر کی صدا آتی تھی۔

طوطا مینا دڑی جی

کوڑی پیسہ دمڑی جی

راجا پہ جا دمڑی جی

دلاور خاں تو اس آواز کو سن کر دیوانہ سا ہو جاتا تھا وہ کئی بار تلوار سونت کر خیمے سے باہر نکل آیا کہ اس فقیر کا سر قلم کر دے مگر وہ فقیر کبھی نظر نہ آیا۔

مگر اس صبح کو عجیب بات ہوئی کہ اس فقیر کی آواز کان میں نہیں آئی۔ شہر آج کچھ خاموش سا تھا۔ ہم ہتھیاروں سے سج رہے تھے کہ اتنے میں بخت خاں کی آواز نے ہمیں سب کو چونکا دیا۔

"دلاور خاں"

دلاور خاں مودب آگے بڑھا۔ بخت خاں نے اسے اپنی انگوٹھی دکھائی۔ دلاور خاں سہم کر چپ ہو گیا۔

عزیز و باتمیزو، جاننا چاہیئے کہ بخت خاں ایک انگوٹھی پہنتا تھا کہ اس میں فیروزے کا ایک قیمتی نگ جڑا ہوا تھا اور اس کی بدولت اس نے بہت سے معرکے جیتے تھے۔

بخت خاں کا معمول تھا کہ روز جب اٹھتا تو پہلے اس نگ کو دیکھتا پھر ہتھیار آراستہ کرتا آج جب اس نے اٹھ کر انگوٹھی پر نظر ڈالی تو نگ چٹخا ہوا تھا۔

تھوڑی دیر میں خیمے پر دستک ہوئی۔ چوبدار ہراساں پریشاں حاضر ہوا۔ عرض کی "حضور خبر بد آئی ہے کہ شہنشاہ قلعہ سے باہر نکل گئے۔"

دوستو مغلوں نے میرے آقائے نامدار سے دغا کی، وہ وقت مجھے خوب یاد ہے گویا آج کی بات ہے کہ بخت خاں مقبرہ ہمایوں میں شہنشاہ کے حضور میں حاضر تھا اور ہم باہر صفیں باندھے تلواریں نیام سے کھینچے کھڑے تھے کہ آج رن پڑے گا، دلوں کے ارمان نکلیں گے، خاکی خاک میں لوٹیں گے۔ لشکر مانند چولہا چڑھے کڑھاؤ کے تاؤ کھاتا تھا اور ہر لشکری مثل سیلِ گرم ابلا پڑتا تھا۔ دفعتاً بخت خاں باہر نکلا، تاؤ کھاتا ہوا، غیض و غضب میں بھرا ہوا۔ چہرہ تمتماتا تھا، منہ سے کف نکلتا تھا اور پیروں کو یوں پٹختا ہوا چل رہا تھا کہ ہم دہل گئے کہ اب دلی کی زمین پھٹی اور اب مقبرۂ ہمایوں بیٹھا۔ مگر دلی کو ابھی اور دن دیکھنے تھے اور مقبرۂ ہمایوں کو کچھ اور نظارہ کرنا تھا کہ بخت خاں نے رکاب میں پاؤں رکھا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا پھر ہم سے مخاطب ہوا، "رفقائے نامدار، سپاہیان وفاشعار ہم سے دغا ہوئی۔ شجاعت و حمیت تیمور کے گھر سے رخصت ہو گئی، غیرت نے اس شہر سے منہ موڑ لیا اور پاس ناموس مٹ گیا۔ اب یہ شہر خراب ہوا۔ اس شہر سے نکل چلو کہ اس نے ہمیں ناکامی کا منہ دکھایا کہ اس نے بخت خاں کو خوار کیا، بخت خاں کی فاتحانہ آن کو مٹی لگایا۔ شاہجہانی قلعہ اپنی جگہ سے ہل گیا جہاں آباد اب خراب ہوا چاہتا ہے، شاہجہان کی زمین ہم پر تنگ ہو گئی مگر اللہ کی زمین بہت وسیع ہے۔ آؤ میدانوں میں نکل چلیں اور پہاڑوں کی راہ لیں کہ بہادر کھلے میدانوں میں لڑتے ہیں اور پہاڑوں پہ مورچے جماتے ہیں۔"

عزیزو با تمیز و، تاب ضبط ہو تو یہ فسانۂ عبرت فزا سنو کہ دونوں وقت ملتے تھے اور ہم دلی سے نکلتے تھے، آفتاب دن بھر کی مسافت سے تھک کر دجلۂ مغرب میں

غرق ہو رہا تھا اور جمنا کے پانی پر سایہ پھیل چکا تھا۔ سایہ شاہجہانی کی فصیلوں اور برجیوں پر بھی پھیل چکا تھا۔ سایہ شہر کی فصیل پر بھی پھیل چکا تھا۔ شہر کی فصیل اور شاہجہانی قلعہ کے برجوں سے دور قطب مینار کی بلندی پر بس ہلکی ہلکی دھوپ مانند ایک سرکتے سائے کے باقی تھی اور کوئی دم میں معدوم ہوا چاہتی تھی، عزیز و باتمیز و شہر کی فصیل پر سایہ پھیل چکا تھا۔ شہر کی فصیل صورت تصویر خاموش تھی۔ برجیوں پہ نصب توپیں کہ کل تک گرا ہیں مار رہی تھیں اور صف اعدا پر آگ اُگل رہی تھیں، خاموش تھیں۔ دور سے کسی اکیلی توپ کی آواز آ رہی تھی۔ شاید لاہوری دروازے کی توپ ابھی تک چلتی تھی۔

ہم دلّی سے نکلے تھے کہ رات نے ہمیں آ لیا اور راہیں تاریک ہو گئیں۔ عجب اندھیرا تھا کہ رستہ کیا معنی ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ مگر بخت خانی لشکر کا سیلاب سارے بند توڑ چکا تھا اور جو قدم اٹھ گئے تھے انہیں کوئی پکڑ نہیں سکتا تھا مشعلچیوں کو حکم ہوا کہ آگے آئیں اور مشالیں جلائیں۔ تب مشالیں روشن ہوئیں۔ اندھیرا جنگل اور دھڑ دھڑ کرتی مشالیں اور گھوڑوں کی ٹاپوں سے نکلتی ہوئی چنگاریاں اور راہ پر قافلۂ بخوم شب کے درمیان جلادِ فلک کہ مثل انگارے کے دہکتا تھا اور ساتھ ساتھ سفر کرتا تھا۔ یوں اندھیرے میں دراڑیں ڈالتا اور جنگلوں کے سینے کو شق کرتا بخت خانی لشکر منزلوں پہ منزلیں طے کرتا تھا اور رات کے پردے میں کہیں سے کہیں پہنچا تھا۔ جانے کیا وقت تھا مگر رات بہت گزر چکی تھی۔ کہ بخت خاں نے گھوڑے کی باگ روکی اور سوال کیا "عزیز و، ہم کس مقام پر ہیں"، ہم سب نے اپنے اپنے گھوڑوں کی باگیں کھینچیں اور دم بخود کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو تکنے لگے۔ کہ ہم میں سے کسی کو پتہ نہ تھا کہ ہم کس مقام پر ہیں، سیدھی راہ چلتے ہیں یا راہ بھولے ہیں۔ تب بخت خاں نے فرمایا "غازیو جانبازو، یوں بے سوچے سمجھے اندھیرے میں بڑھے چلے جانا قرین مصلحت نہیں۔ جان بوجھ کر اپنے تئیں خطرے میں ڈالنا کوئی حکمت نہیں چاہیئے کہ منزل کرو اور دو گھڑی آرام کر لو کہ سو لیں اور سوچ لیں کہ ہم کہاں ہیں، کس طرف

جاتے ہیں اور کس طرف جانا ہے۔ پردۂ شب کو غنیمت جانو کہ غنیم کی نظر سے پوشیدہ ہیں۔ صبح ہوگی تو قیامت آئے گی اور ہمارے سفر کی خبر دشمنوں تک جائے گی۔"

یہ حکم سن کر ہم گھوڑوں سے اترے اور اس دشتِ پرخطر میں حضر کیا کہ اردگرد دور تک اونچے کالے درختوں کے سوا کچھ دکھائی نہ پڑتا تھا۔ ہم کیا بے سروسامانی میں دلی سے چلے تھے۔ کہ سامان سفر و حضر بھی پورا ہمراہ نہیں تھا جب گھوڑے کو درخت کے تنے سے باندھ، زین سر کے نیچے رکھ زمین کے فرش پر آسمان کی چھت کے نیچے دراز ہوا تو سمند خاں نے کہ معرکہ کارزار میں کیسا ہی رن پڑے کبھی ہراساں نہ ہوا اس وقت دیو قامت مخلوقات بسیہ پوش اشجار بے شمار کے نرغے میں اپنے تئیں بہت حقیر جانا۔ اشجار بے شمار کے لشکر سے پرے دشت فلک میں انگنت مشعل برداروں کا جلوس جلاد فلک کے ساتھ رواں تھا۔ دفعتاً ایک ستارہ ٹوٹا اور پہنائے فلک میں ایک روشن لکیر لیوں دوڑتی چلی گئی کہ میدانِ جنگ میں کوئی گراں ڈیل سپاہی گرا ہے۔ اور اس کی خبر صف بصف کراں تاکراں پھیلتی ہے۔ ہم نے کالے جنگل میں پڑاؤ کیا تھا اور عرصہ فلک پر فوج نجوم کا کوچ جاری تھا۔ معاً مجھے خیال آیا کہ فوج نجوم بس گزرا چاہتی ہے۔ اور آسمان کا میدان خالی ہوا چاہتا ہے۔ جانے کیوں اس خیال سے میرا دل دھڑ دھڑ کرنے لگا اور میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنکھیں بند ہوئی تھیں کہ نیند کے لشکر نے یلغار کی اور دیو قامت اشجار بے شمار اور آسمان کے ان گنت مشعل بردار سب اس کی گرد میں گم ہوتے چلے گئے۔

ستارۂ سحری کی نمود کے ساتھ ارادۂ کوچ کا ورود ہوا۔ جب میری آنکھ کھلی تو بخت خاں آراستہ ہو چکا تھا۔ مگر اس کے چہرے سے تشویش عیاں تھی۔ دلاور خاں نے بڑھ کر عرض کی کہ "آقائے نامدار آج حضور کو تشویش کیسی ہے" جواب دیا "دلاور خاں رات ہم نے عجب خواب دیکھا کہ اس وقت سے نیند خواب ہوئی اور رات آنکھوں میں کٹی" اس پر ہم سب کو فکر فزوں ہوئی اور سوال کیا کہ "اے خداوند نعمت وہ خواب کیا تھا جس نے ہمارے آقا کو بے آرام کیا

اور ہمارے لئے فکر کا سامان کیا۔"

تب بخت خان یوں گویا ہوا۔ اے یارانِ باوفا اور عزیزانِ باوفا کیفیت اس خواب کی یہ ہے کہ دیکھا کہ ایک لق و دق صحرا ہے اور بخت خان اکیلا ہے۔ لشکری بچھڑ چکے ہیں، سپاہی چھٹ چکے ہیں۔ پھر دیکھا ایک مینار ہے کہ انگاروں کا ایک انبار ہے کرسی اس کی چکی کے پاٹ کی صورت بنی ہے اور گرم رفتاری سے گھومتی ہے کہ مینار پر نگاہ نہیں ٹکتی، بس ایک شعلہ سینۂ گیتی سے تا چرخِ چنبری بلند ہوتا گردش کرتا نظر آتا ہے۔ میں ڈرا کہ یا معبود یہ کیا سحر کا کارخانہ ہے مگر فوراً ہی خیال آیا کہ یوں ڈرنا خلاف شیوۂ مردانہ ہے۔ نعرۂ حیدری یا علی بلند کیا اور گھوڑے کو ایڑ دے کر دم کے دم میں مینار کے پاس پہنچا۔ عجب ہوا کہ چکی کا پاٹ گھومتے گھومتے رک گیا اب جو دیکھا تو اور ہی منظر کھلا کہ وسیع و عریض قطر کی ایک چکی ہے، چکی پر ایک بلند و بالا مینار سر تا سر سنگِ سرخ کا ہے، مینار پہ ایک برج ہے، برج میں ایک بڑا سا نقارہ رکھا ہے۔ نقارے کے برابر ایک چوب دھری ہے اے یارانِ باوفا اور اے عزیزانِ باصفا اس وقت مجھے طرفہ خیال آیا کہ مینار پہ چڑھ اور اس نقارے کو بجا کر قدرت خدا کا تماشا دیکھو۔ اس بلندی سے نقارے کی آواز فاصلوں پہ غالب اور ملک پر محیط ہو گی جس بستی، جس جنگل میں بخت خان کا سپاہی آوارہ۔ بے خانماں پھرتا ہے وہ اس آواز کو سنے گا اور رخ اس سمت کا کرے گا میرے دل میں ابھی یہ خیال آیا ہی تھا کہ مینار کے اندر سے صدا آئی۔ اے بد بخت اپنی کڑیل جوانی پہ رحم کر اس مینار سرا سر نار سے حذر کر، یہ زندگی اور موت کا ہولناک کھیل ہے۔ اس کھیل میں تقفصِ جان ہے، جی کا زیاں ہے۔" اس صدا کو میں سن کے لدکار جانا اور پیچھے ہٹنا اپنی وضع سپاہیانہ کے خلاف سمجھا۔ سوچا ہر چہ بادا باد آید بر سر فرزند آدم اور اندر اندھا دھند مینار میں داخل ہو گیا۔ وہ مینار باہر سے مثل انگارہ روشن لیکن اندر سے تیرہ و تار تھا، گرم مانند کرۂ نار تھا۔ زینہ پیچدار تھا، پیچ میں پیچ یہ پڑا کہ مینار کے اندر قدم رکھتے ہی چکی پھر گھومنے لگی اور مینار پیچ کھانے لگا۔ اے عزیزو اس وقت مجھ پر

اپنی ناطاقتی کھلی اور عجب رقت طاری ہوئی کہ بخت خاں تو اپنے تئیں بہت بہادر جانتا تھا اور شجاعان بے مثال اور حریفان رستم وزال سے نبرد آزما ہوتا تھا۔ زمانے کی گردش نے کیا دن دکھایا ہے کہ وقت کی چکی میں بے وجہ پیسے جاتے ہیں اور سپاہی ہوکر بے لڑے مارے جاتے ہیں ناگہاں کیا دیکھتا ہوں کہ ٹاپوں کی آواز سے سارا دشت گونج گیا۔ ایک سوار سبز پوش قبضے میں شمشیر آبدار، چہرے پر نقاب داخل ہوا کہ اس کے اندر قدم رکھتے ہی مینار گھومتا گھومتا تھم گیا اور زینے کا راستہ اجل گیا اور ہماری آنکھ کھل گئی۔

پھر بخت خاں نے سکوت اختیار کر لیا اور سپاہیوں کو وسوسوں اور وہموں نے گھیر لیا۔ اس وقت مجھے معاً اپنے جد امجد کی بات یاد آئی اور مؤدب عرض کیا کہ "آقائے نامدار گستاخی معاف ہو، یہ خواب نہیں تھا، بشارت تھی۔"

بخت خاں نے نہایت وقار سے سر بلند کیا اور مجھ پر نظر فرمائی۔ "وہ کیونکر؟"

حکایت شیر شاہی مینار کی

میں مؤدب ہو بیٹھا اور یوں عرض کیا کہ "اے آقائے ولی نعمت۔ میں سمند خاں ابن ارجمند خاں ابن دماوند خاں خانوادہ اس خاندان عالی شان و بلند نشان کا ہوں جس کا سلسلہ نسب شیر شاہ سوری سے ملتا ہے۔ میں نے اپنے جد امجد سے اور میرے جد امجد نے اپنے جد امجد سے یوں سنا ہے کہ ہمارے جد اعلیٰ حضرت شیر شاہ سوری نے کرۂ ارض کے قلب میں ایک کیل بصورت مینار بلند پیوست کی تھی۔ یہ زمین پر ان کی آخری فتح تھی۔ اے آقائے ولی نعمت اور اے یارانِ طریقت، کرۂ ارض فاتح گیتی حضرت شیر شاہ سوری کے تئیں گیند کا گولا تھا کہ جس طرح چاہتے تھے اچھالتے تھے اور لپکتے تھے۔ ارض ہند کی انہوں نے ایسی طنابیں کھینچیں اور سڑکوں کی زنجیریں کس طرح پہنائیں کہ آج تک کلکتہ سے پشاور تک کا فاصلہ ایک زنجیر میں جکڑا ہوا ہے، جانا جاتا ہے کہ ایک بار شیر شاہی لشکر قلب گیتی کی راہ سے

گزرا تھا۔ سمندروں کی گرد میں فاصلے گرد ہو رہے تھے اور ٹاپوں کی دھمک گاؤ ارض تک پہنچ رہی تھی۔ ناگاہ ایک دشت پر ہول نظر آیا کہ ریت مثل بالو کے جلتی بلتی تھی اور سطح زمین کلیجے کی صورت دھڑکتی تھی۔ گھوڑوں کے قدم رک گئے۔ سوار ٹھٹھک گئے۔ حضرت شیر شاہ نے لاکھ گھوڑے کو ایڑ دی مگر وہ رہوار جو زمین و زمان کی گردشوں کو اپنی ٹاپوں کی گرد جانتا تھا ٹس سے مس نہ ہوا وزرائے باتدبیر نے ڈرتے ڈرتے مشورہ دیا کہ "جہاں پناہ اس پرخطرہ راہ سے گزریے اور دوسری راہ سے چلیے"۔ حضرت شیر شاہ کو جلال آگیا فرمایا کہ "زمین سے ہزیمت اٹھانا مردانِ فلک وقار کے شایان نہیں اور راہ کی دشواری سے ارض شکاروں کا ڈر جانا طریق ارض شکاری نہیں۔ ہمارے سمند سمندر اثر کا یوں ٹھٹھکنا ہماری توقع کے خلاف اور اس کی روش سے دور ہے۔ مقرر اس میں کوئی راز مستور ہے۔ روایت کشور کشائی کا تقاضا ہے کہ اس گرہ کو کھولا جائے اور اس زمین کی حقیقت کو سمجھا جائے۔

پس شیر شاہی لشکر نے اس دشت دہشت اثر میں پڑاؤ کیا اور دن رات تدبیر اس زمین کے بھید کو کھولنے کی ہوتی رہی۔ دو دن تک لشکری تگ و دو کرتے رہے۔ مگر سراغ اس راز کا نہ ملا۔ تیسرے دن فلک جناب نے بنفسِ نفیس اس گرہ کو کشود کرنے کی ٹھانی۔ رہوار ارض شکار پہ سوار ہوئے اور عزم بالجزم کیا کہ جو ہو سو ہو آج ہم اس دشت کو ضرور عبور کریں گے رہوار کو ایڑ دیا چاہتے تھے کہ ایک مرد بزرگ نامعلوم سمت سے نمودار ہوا اور آگے بڑھ کر لگام تھام لی اور بولا "اے شیر شاہ اس ارادے سے باز آ اپنی رعیت پہ رحم کھا۔ اس دشت بلا میں جس بادشاہ نے قدم رکھا سلطنت کو اس کی زوال ہوا، رعایا کا ابتر حال ہوا، برباد ملک و مال ہوا۔"

دریافت فرمایا "اس بلا کا کیا باعث ہے؟"

اس مرد دانا نے جواب دیا "اے کشور کشا گیتی ستاں! یہ مقام زمین کا قلب ہے گاؤ زمین کے دونوں سینگوں کے عین درمیان واقع ہے قلب گیتی مقام کرب و بلا ہے کہ مردان خطر پسند

کو للکارتا اور پچھاڑتا ہے جو دلاور قلب گیتی کو مٹھی میں لے گا اور قابو پائے گا۔ چار دانگ میں ڈنکا اس کا بجے گا اور ہمالہ سے لے کر ندھیاچل اور ندھیاچل سے راس کماری تک سلطنت اس کی پھیلے گی۔

تب میرے جدامجد کو جلال آیا کہ جب کشورکشائی کے پرخطر میدان میں قدم رکھا ہے تو جھجکنا کیوں اور آدھی راہ چل کر پلٹنا کس واسطے۔ بڑھ کر نام بوتراب کا لیا اور نیزہ پھینک کر ایسا مارا کہ بچوں بیچ اس دشت کے گڑ گیا۔ اثر اس کا عجب ہوا کہ دشت ہلتے ہلتے رک گیا۔ تب جدامجد نے حکم دیا کہ اس فتح کو پائے کمال تک پہنچائے اور ایک مینار بلند تعمیر کیجئے کہ برج میں اس کے نقارہ رکھا جائے۔ نقارے پہ چوب پڑے اور شیرشاہ کی فتح کا عالم میں شور پڑے۔

تب دور دور سے ہوشیار معمار بلائے گئے اور نقشے تعمیر کے جمائے گئے۔ ایک مینار فلک آثار تعمیر ہوا کہ سات اس کی منزلیں اور سات اس کے زینے تھے۔ ساتویں منزل میں ایک برج تھا۔ اس میں نقارہ اور چوب رکھی گئی کہ نیک ساعت شبھ گھڑی دیکھ کر شیرشاہ کے نام کا نقارہ بجے۔ ادھر یہ انتظام تھا ادھر کچھ اور ہوا چاہتا تھا۔ ناگہاں جانب مغرب سے غبار اٹھا اور ٹاپوں کی آواز بلند ہوئی جب ذرا گرد چھٹی تو دیکھا کہ راجپوتوں کی فوج موج موج چلی آتی ہے اور طوفان بلا بن کر ٹوٹا چاہتی ہے۔ شیرشاہی لشکر دم کے دم میں آراستہ ہوا اس طوفان بلا سے قیامت بن کر ٹکرایا اور دشمن کو دُور تک بھگایا مگر ستم ہوا کہ دشمن کا تعاقب کرتے کرتے لشکر اتنی دور نکل گیا کہ مینار فلک آثار نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ تب دشمن سنبھلا، صفیں درست کیں اور بلا کا رن پڑا۔ مگر مینار نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا اور شیرشاہ کی زندگی کا آفتاب غروب ہوا چاہتا تھا۔

میں نے اپنے جدامجد سے اور میرے جدامجد نے اپنے جدامجد سے یوں سنا ہے کہ ہمارے جداعلیٰ حضرت شیرشاہ نے مرتے دم آل و انصار کو وصیت فرمائی تھی کہ جب شیرشاہی مینار کے نقارے کی آواز کان میں پڑے جاننا کہ شیرشاہ کی مہم کو منزل تک پہنچانے والا پیدا ہوا اور

اس کی نعمت پہنچا ۔ اے آقائے ولی نعمت اور اے یارانِ طریقت دیکھنا خواب میں اس مینار کا ظاہر کرتا ہے کہ نقارۂ شیر شاہی پر چوب پڑنے کا وقت آ پہنچا ۔"

بخت خاں نے تعبیر اپنی رویا کی سن لی تو یوں گویا ہوا کہ" اے رفیق، وہ مینار کس سمت میں ہے اور کتنے دنوں کی راہ ہے ۔"

میں نے مؤدب عرض کیا کہ" آقائے ولی نعمت، میں نے اپنے جدِ امجد سے اور میرے جدِ امجد نے اپنے جدِ امجد سے یوں سنا ہے کہ شمال مغرب میں برس دن کی راہ ایک گھنی بنی ہے گھنی بنی سے پرے کالی ندی ہے، کالی ندی کے اس پار وہ دشت پر خار ہے' اس میں وہ مینار فلک آثار ہے ۔"

اس عاجز کا یہ کلام سن کر بخت خان یوں گویا ہوا کہ اے رفقائے نامدار اور اے غازیانِ وفا شعار، شیر شاہ نے زمین کی طنابیں خوب کھینچیں اور بے فرسنگ فاصلوں کو خوب جکڑا مگر وقت کے دریا پر بند نہ باندھا ۔ وقت بغیر کرۂ ارض مٹی کا ڈھیلا ہے ۔ وقت نے شیر شاہ سے دغا کی اور زمین کو اس کے چنگل سے چھڑا لیا کہ قلب گیتی پھر مانند کلیجے کے دھڑکتا ہے اور شیر شاہی مینار یسانِ آسیائے دہر گردش کرتا ہے ۔ جرنیلی سڑک فوج فرنگ کے قدموں تلے کراہتی رہے ۔ چوٹ پر اس کی ڈلہوزی کی بنائی ہوئی دھواں گاڑی دوڑتی ہے، شیر شاہی سرائیں ویران ہو گئیں، بیاؤ سوکھ گئے، ٹھنڈے میٹھے کنوئیں کچھ کھاری ہوئے کچھ خاک سے آٹے کچھ لاشوں سے پٹے اور گھنے پیڑوں سے چھاؤں رخصت ہو گئی ۔ جرنیلی سڑک کے پیڑ چھاؤں سے محروم، مسافر نوازی سے مجبور، برقی تاروں میں جکڑے ہوئے سر برہنہ شہزادیوں کو نازک اندامیوں کو گل بدنوں کو حیراں حیراں پھرتے، رنج سفر اٹھاتے، ہرج مرج کھینچتے ۔ ششدر کھڑے دیکھتے ہیں اور اپنے لگانے والے کے اقبال کا نوحہ کرتے ہیں ۔ رفیقو، وقت کی زال بیسوا نے شیر شاہ سے دغا کی شیر شاہی سڑک کے یہ قطار قطار قیدی شیر شاہ کے جانشینوں کو پکارتے ہیں ۔ غازیو اس پکار کو سنو، ان برقی تاروں کو کاٹو اور اشجار

سایہ دار کوان کا سایہ اور ہریالی اور شادابی واپس دو۔ آج عرصۂ حیات عرصۂ جنگ ہے، مقام نام و ننگ ہے، وقت سے لڑائی ہے، منہ موڑنے میں رسوائی ہے، وقت کے دھارے کو موڑو، شیر شاہی مینار کی گردش کو روکو کہ نقارے پر چوب پڑے اور چار دانگ میں شیر شاہ کا ڈنکا بجے۔ گھوڑوں کی باگیں اٹھاؤ اور برس دن کی راہ مہینے میں طے کرو کہ زمین و زماں کے مخالف یہی پہلا مورچہ ہے اور ارض شکاروں اور فاتحانِ دہر کا یہی اوّلین معرکہ ہے۔"

تب بخت خاں بصد جاہ و جلال سمند سمند ساتر صبا قدم پہ سوار ہوا۔ میں نے یوں جانا کہ ایک بھاری تودا فضا میں بلند ہوا۔ لشکری صف بصف گھوڑوں پر سوار ہوئے، عازم مینار ہوئے جنگل کھنڈل گئے، صحرا مسل گئے۔ اذا زلزلت الارض زلزالھا کا منظر پیدا ہوا۔ دھرتی کا کلیجہ شق ہوا۔ عزیز و عجب سفر تھا کہ گھوڑوں کی پیٹھ ہمارے جسم کا جز بنی تھی۔ سلسلہ روز و شب درہم ہوا تھا، صبح و شام کا فرق اٹھ گیا تھا۔ ساعتوں اور پہروں کی تقسیم مٹ گئی تھی۔ وقت کے بہتے دھارے میں کیا روز و شب کے بلبلے اور کیا ساعتوں اور پہروں کے مصنوعی ڈونگے سب بہ گئے تھے۔ وقت کا مسلسل بہتا دھارا تھا اور ہم تھے، ہمارے سمندر اثر گھوڑے تھے۔

چلتے چلتے ایک گھنی بنی میں گزر ہوا اس میں قدم رکھتے ہی اندھیرا ہوا۔ عجب الخلقت وحوش و طیور نمودار ہوئے اور ایسی مہیب آوازیں آنی شروع ہوئیں کہ بہادروں کا زہرہ آب ہو شیر مردوں کا کلیجہ پھٹ جائے۔ اس وقت بخت خاں کی صدائے مہیب لشکر میں گونجی کہ "غازیو، آج عرصہ حیات عرصۂ جنگ ہے، مقام نام و ننگ ہے، وقت سے لڑائی ہے منہ موڑنے میں رسوائی ہے"، اس صدا سے سپاہیوں نے حوصلہ پکڑا اور ایک مرتبہ پھر گھوڑے یوں دوڑے کہ وہ مہیب شور ان کی ٹاپوں کی آوازوں کی گرد بن کر رہ گیا۔

تذکرہ کالی ندی کا

خدا خدا کر کے اس گھنی بنی سے نکلے۔ مگر یہاں اندھیرا سوا تھا۔ کالی ندی بہتی تھی اور

لہریں یوں اٹھتی تھیں۔ جیسے رات کے اندھیرے میں تلواریں چلتی ہیں اور خنجر چمکتے ہیں اور اس کی گرجتی دھار..... عزیز و پانی کی دھار عجب گرجتی ہے۔ جاننا چاہیئے کہ اس برس پانی زور برسا تھا۔ ہند کے سارے دریا امنڈے ہوئے تھے جب ہم غازی آباد سے آگے نکلے تھے تو رات کو دور سے بار بار ایک آواز آتی تھی۔

ندی نربدا کا جل گرجے گرجے گنگا کی دھار

بخت خاں نے پوچھا۔ "رفیقو یہ آواز کیسی ہے کہ دل اسے سن کر دھڑکتا ہے اور لہو کی گردش آپ ہی آپ تیز ہو جاتی ہے یہ کوئی ندائے غیب ہے یا کسی حادثے کی خبر۔"

اس پر ایک میرٹھ کا غازی یوں گویا ہوا "اے آقا، یہ نہ تو ندائے غیب ہے نہ کسی حادثے کی خبر ہے ہماری کسی بستی میں آلھا اودل پڑھی جاتی ہے۔ برسات اب کے بہت لمبی کھنچی ہے کہ جنم اشٹمی بھی ہولی پر مینہ کی جھڑی اسی طرح لگی ہے اور آلھا اودل کی سبھا بستی بستی جمی ہے۔"

عزیز و برسات اس بار سچ مچ بہت لمبی کھنچی تھی۔ پانی زور برسا تھا۔ تال تلیاں ابھی تک لبالب کٹوروں کی طرح چھلکتی تھیں اور ندیاں چشم پر آب کی طرح بہتی تھیں۔ جمنا کی لہروں کو ہم فصیل سے سر پٹکتا چھوڑ آئے تھے۔ گنگا کی دھار ہردوار سے کلکتہ تک گرجتی تھی۔ گومتی کا پانی مانند فرات کے ابلتا تھا اور نربدا ندی تانتیا توپی کی فوج کی طرح کبھی پھیلتے پھیلتے پچاس کوس چوڑا پاٹ بناتی تھی کبھی سکڑ کر پہاڑوں کے اندھیرے میں گم ہو جاتی تھی مگر کالی ندی سب ندیوں سے نرالی تھی کہ اس کے اور چھور کا کچھ پتہ نہ چلتا تھا اور اس کی تھاہ کی کوئی تھاہ نہ لگتی تھی۔ ہم سب دم بخود تھے۔ کالی ندی کی دھار گرج رہی تھی۔ گاہ گمان ہوا کہ کوئی لشکر یلغار کرتا ہے، گاہ خیال گزرا کہ پہاڑوں سے کوئی آندھی اٹھتی ہے عزیز و پانی کی آواز عجب ہوتی ہے جن غازیوں اور سورماؤں کے سیلاب پر توپ و تفنگ سے آراستہ فرنگی بند نہ باندھ سکے تھے انہیں پانی کی آواز نے دم بخود کر دیا تھا۔ دفعتاً ایک گھوڑا دہشت بھری آواز میں ہنہنایا اور صف سے ٹوٹ کر معہ سوار سرپٹ

بھاگا اور درختوں میں مڑ گیا۔

سب ابھی ششدر تھے کہ یہ کیا ہوا اور کیونکر ہوا کہ اتنے میں میں نے اپنے برابر دلاور خاں کو دیکھا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر مثل بید کے کانپتا ہے اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ندی کی طرف تکتا ہے میں نے آنکھ جھپکی تھی کہ دلاور خاں نے دہشت میں نعرہ مارا اور گھوڑے سے کود کر آن کی آن میں ندی میں چھلانگ گیا۔

دلاور خاں کا ندی میں چھلانگنا قیامت ہوا۔ ندی کی دھار زور گرجی جانو بادل گرجتے ہیں۔ عزیز و بادل زمین میں بھی گرجتے ہیں اور بجلی پانی کی تہ میں بھی کڑکتی ہے۔ اس ساعت ندی میں بادل بھی گرجے اور بجلی بھی کڑکی کہ جانو زمین کی تہ پھٹ گئی اور اندر دبا ہوا لاوا پھوٹ پڑا۔ ایک آندھی چلی کہ زمین و زمان تیرہ و تار ہوئے اور پھر خون کی بارش ہونے لگی۔ کالی ندی پہ خون برسا اور آسمان سرخ بوٹی کی مثل ہو گیا اور جنگل لال انگاروں کی طرح دہکنے لگا۔ گھوڑے ہنہنائے، صفیں تتر بتر ہو گئیں، سپاہیوں کے ہاتھوں سے باگیں چھوٹ گئیں اور جس گھوڑے کا جدھر منہ اٹھ گیا دہشت میں ہنہناتا گاہ معہ سوار کے گاہ سوار کو پٹخ سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔

اس رستا خیز میں میرا گھوڑا بھی بگڑا اور ڈراؤنی آواز میں ہنہناتا بکٹٹ بھاگ چھٹا۔ رات کے اندھیرے میں کچھ پتہ نہ چلا کہ کہاں جاتا ہوں۔ باگ پہ ہاتھ تھا نہ پاؤں رکاب میں تھے جب تڑکا ہوا تو اپنے تئیں اکیلا ایک سنسان جگہ میں پایا۔ نہ وہ کالی ندی تھی نہ گھنی بنی تھی۔ نہ لشکری نہ میر لشکر۔ آدمی کا دور دور پتہ نہ تھا، جنگل بھائیں بھائیں کرتا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لیا اور گھوڑے کو اس کے حال پر چھوڑ دیا کہ جس راہ چلتا ہے چلا چلے۔

داستان شہر ویران کی

چلتے چلتے راہ میں ایک بستی نظر آئی۔ خدا کا شکر ادا کیا اور بستی میں داخل ہوا مگر

وہ بستی عجیب تھی، خالی ڈھنڈار پڑی تھی۔ نہ مساکین نہ دکاکین۔ گلی کوچے ہو حق کرتے تھے ہر مکان ویران، ہر مکان پہ گولیوں کے نشان، حویلیاں ڈھئی ہوئیں۔ دکانیں گری ہوئیں، غارت گری کے نشان مکان مکان، خونریزی کے آثار گلی گلی۔ چوکوں اور بازاروں میں جا بجا لاشیں پڑی تھیں دکانوں کے دروازے کھلے تھے، مال بکھرا ہوا پڑا تھا۔ مکانوں کے دروازے شکستہ تھے پہریدار غائب تھے۔ میں تصویرِ حیرت بنا کچھ ہراساں کچھ پریشاں اس شہر مرگ میں چلا جاتا تھا کہ سامنے ایک عالی شان حویلی نظر آئی۔ توپوں کے گولوں کے نشان جا بجا تھے۔ بہت سے کنگرے گر گئے تھے اور دریچے اڑ گئے تھے کہ یوں اس کی بلند دیواروں میں بھمباتے کھل گئے تھے پھاٹک چوپٹ کھلا پڑا تھا۔ ڈیوڑھی خالی تھی۔ بس ایک ہاتھی زنجیر تڑا اسے آوارہ آوارہ احاطے میں پھر رہا تھا اور فوارے کے اردگرد کاہی جمے پانی کو سونڈ سے گنجول رہا تھا۔ اس عبرت فزا منظر کو دیکھ کر میرے دل میں عجب خیال پیدا کہ اندر چل کر دیکھو شاید اس افسانے کے آغاز اور انجام کا کچھ سراغ ملے۔

میں نے اندر قدم رکھا تو جانوروں میں ایک شور پڑا دیکھا۔ بطخوں کے جالی دار ڈربوں میں ایک قیامت مچی تھی اور ٹاپوں کے اندر مرغیاں چلاتی تھیں۔ ایک بڑی سی صندلی بلی ایک کمرے کے اندر سے نکلی اور مجھے حسرت بھری طلب آمیز نگاہوں سے دیکھ میاں میاؤں کرنے لگی۔ میں نے ڈربے کھولے اور ٹاپے اٹھائے تو بطخیں اور مرغیاں شور مچاتی بے تابانہ فوارے کے اردگرد ٹھہرے ہوئے کاہی بھرے پانی کی طرف لپکیں اور ایک دم سے ان گنت چونچیں اور پنجے کاہی بھرے ٹھہرے ہوئے پانی میں پیوستہ ہو گئے۔

پھر میں نے اندر قدم رکھا۔ ایوان ایک نظر آیا وسیع و عریض، سقف بلند نصف دائرے کی صورت، اونچے اونچے ستون، بڑی بڑی دیواریں کہ اب سب بچی کھچی تھیں۔ قد آدم آئینے شکستہ تھے، جھاڑ فانوس چکنا چور ہوئے تھے، شمعدان، گلدان، اگردان، گلاب پاش، خوبصورت کشتیاں نازک صراحیاں، جھمکتے کٹورے اجلے پیالے، سنہری روپہلی جھالروں والے

بھاری پردے، رنگ رنگ لاثانی تصویریں۔ غرض صنعت انسانی کا ایک کارخانہ تھا کہ بکھرا پڑا تھا اور اپنی بے قیمتی و ناقدری کا نوحہ کرتا تھا۔

اس ایوان وسیع سے نکلا تو ایک صحن کشادہ میں آیا۔ وہ کشادہ صحن خالی پڑا تھا اور فوارہ بند تھا، سنگ مرمر کا حوض سوکھا پڑا تھا۔ ناگاہ ایک طوطے کے پھڑ پھڑانے اور چلانے کی آواز کان میں آئی۔ نظر اُٹھائی تو دیکھا کہ سامنے ایک لمبا چوڑا دالان ہے، دالان میں ایک کندہ پڑا ہے۔ کندے میں ایک نفیس پنجرہ لٹکا ہے۔ پنجرے میں ایک طوطا، لال چھپا چونچ گلے میں کنٹھی بازو پر سرخ پیسہ، پھڑ پھڑاتا ہے اور چونچ کھولے ہانپتا ہے۔ میں نے بڑھ کر پنجرہ اتارا۔ بہت ڈھونڈنے پر ایک روڑے گھر سے میں تھوڑا سا پانی نظر آیا۔ تب طوطا چلایا۔ "حق اللہ پاک ذات اللہ، بی بی کنوئیں میں"، تب مجھ پر یہ وہ راز ہویدا ہوا۔ اس دالان کے عقب میں اندھا کنواں تھا۔ وہاں سے یہ آواز آتی تھی۔ میں نے اپنا صافا کھولا اور کنوئیں میں لٹکایا۔ کسی نے اندھیرے میں وہ صافا پکڑا اور میں نے آہستہ آہستہ اسے کھینچنا شروع کیا۔ جب وہ شے کنارے پر آئی تو عجب منظر نظر آیا۔ گویا اندھیرے سے روشنی کی کونپل پھوٹی ہے یا سیپی کی ظلمت سے موتی نمودار ہوا ہے۔ بدن روشنی رخساروں میں دیے جلتے ہوئے لویں کو دیتی ہوئیں۔ مگر روشنی غبار میں تھی، ملبوس لیر لیر، مٹی میں اٹا ہوا، بال الجھے ہوئے، ہونٹوں پر پپڑیاں، لب بند، غشی کی کیفیت۔ میں نے جلدی سے اس نور کے پتلے کو گود میں اٹھایا اور چھپر کٹ پر ڈالا۔ نبض دیکھی۔ رخسار اور پیشانی کو چھو کر دیکھا، منہ پر پانی چھڑکا، ہونٹ کھول کر ایک چلو پانی ڈالا۔ منہ پہ پانی پڑا تو اس نے جھرجھری لی، آنکھیں کھولیں اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ میرا دم میں دم آیا۔

وہ گلشنِ خوبی غم و الم کی تصویر بنی دیر چپ بیٹھی رہی۔ میری طرف توجہ نہ کی اور میری جرأت بھی نہ ہوئی کہ اس سے بات کروں پھر اس نے لیر لیر لباس کو دیکھا اور چھپر کھٹ سے اُٹھ حمام کی طرف ہو لی۔